درس ۲۶

اُمّتِ مُسلمہ سے خطاب کے ضمن میں
قرآنِ حکیم کی جامع ترین سورت
اُمُّ المُسَبِّحات : سورۃ الحدید
(۵)

نحمدہٗ ونصلی علٰی رسولہ الکریم ...... امّا بعد:

اعوذ باللّٰہ من الشّیطٰن الرّجیم ۔ بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾

اِلٰی قولہٖ تعالٰی: ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ﴾ ...... صدق اللّٰہ العظیم

''وہی اوّل ہے' وہی آخر ہے' وہی ظاہر ہے' وہی باطن ہے' اور وہ ہر شے کا علم رکھتا ہے'' ...... ''وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو۔ اور جو کام تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔''

اسماءِ باری تعالٰی کے درمیان حرفِ عطف کا مسئلہ

میں اگرچہ اپنے طور پر تو فیصلہ کر چکا تھا کہ سورۃ الحدید کے حصہ اوّل پر' جو چھ آیات پر مشتمل ہے' ہماری گفتگو اب مکمل ہو گئی ہے اور اب ہمیں آگے بڑھنا ہے۔ لیکن گزشتہ درس کے بارے میں مجھ سے ایک استفسار کیا گیا ہے جس سے نشان دہی ہوئی ہے کہ میری گفتگو میں ایک خلا رہ گیا ہے جسے پُر ہونا چاہئے۔ دوسرے یہ کہ وحدت الوجود کے ضمن میں اب تک ہونے والی گفتگو کے بارے میں مجھے یہ احساس ہوا ہے کہ شاید میرا ذاتی موقف پورے طور پر واضح نہیں ہو سکا اور عین ممکن ہے کہ زندگی میں

© rasailojaraid.com

آخری مرتبہ ان آیات پر گفتگو ہو رہی ہو' لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ وحدت الوجود کے بارے میں اپنا ذاتی موقف بھی پوری طرح وضاحت سے بیان کر دوں' مبادا کوئی مغالطہ باقی رہے اور غلط فہمی پیدا ہو جائے۔ جن حضرات پر یہ بحث کچھ گراں گزر رہی ہو اُن سے میں معذرت خواہ ہوں۔ متذکرہ بالا دو اسباب کی بناء پر ہمیں ابھی اپنے سابقہ موضوع کو جاری رکھنا ہے۔

میں نے یہ کہا تھا کہ قرآن مجید میں صرف یہ ایک مقام ہے ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ﴾ جہاں اللہ تعالیٰ کے اسماء کے مابین حرف عطف آیا ہے۔ اور نحو کا قاعدہ یہ ہے کہ معطوف اور معطوف الیہ میں مغائرت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں اسی سلسلۂ سُوَر میں سورۃ الحشر کے آخر میں جو آیت مبارکہ وارد ہوئی ہے وہاں تسلسل کے ساتھ اللہ کے آٹھ اسماء آئے ہیں' لیکن ان کے درمیان کہیں کوئی حرف عطف نہیں ہے ﴿اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ۭ﴾ جبکہ یہ واحد مقام ہے جہاں حرف عطف آیا ہے۔ اس ضمن میں مجھ سے سوال کیا گیا ہے کہ اس مقام پر اسماء باری تعالیٰ کے درمیان حرفِ عطف کیوں آیا ہے؟ چنانچہ اس ضمن میں وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا' اوّل' آخر' ظاہر اور باطن یہ چاروں اسماء ایسے ہیں جو کسی نسبت اضافی کا تقاضا کرتے ہیں۔ جیسے اَوَّلُہٗ' آخِرُہٗ' ظَاھِرُہٗ' بَاطِنُہٗ۔ میں نے مثال دی تھی کہ حضور ﷺ نے شعبان کے آخری دن ایک خطبہ ارشاد فرمایا تھا جس میں رمضان المبارک کی عظمت کا بیان ہے۔ اس کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا ہے: ((اَوَّلُہٗ رَحْمَۃٌ وَاَوْسَطُہٗ مَغْفِرَۃٌ وَآخِرُہٗ عِتْقٌ مِنَ النَّارِ)) ''اس (ماہِ مبارک) کا پہلا حصہ (عشرہ) رحمت ہے' دوسرا حصہ مغفرت ہے اور آخری (عشرہ) آگ سے نجات ہے''۔ اسی طرح ظاہر و باطن کے لئے اسی سورۃ کے دوسرے رکوع میں الفاظ آئے ہیں: ﴿فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ۭ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ﴾ یہاں باطن کی اضافت بھی ''ہٗ'' کی طرف ہے اور ظاہر کی اضافت بھی ''ہٗ'' کی طرف ہے۔ تو درحقیقت زیرِ نظر

آیت میں مراد یہ ہے کہ اس سلسلۂ کون و مکان' اس سلسلۂ تخلیق کا اوّل بھی اللہ ہے' آخر بھی اللہ ہے' اس کا ظاہر بھی اللہ ہے اور باطن بھی اللہ ہے۔

یہاں یہ بات سمجھ میں آ جانی چاہئے کہ اوّل و آخر میں تو لازماً مغائرت ہو گی۔ اگر درمیان میں کوئی فصل ہے' کوئی زمانی بُعد ہے تو اَوَّلُـهٗ وَاٰخِـرُهٗ ایک وقت میں نہیں ہو سکتے۔ خود ان الفاظ کا تقاضا ہے کہ ان میں لازماً مغائرت ہونی چاہئے۔ یوں سمجھئے کہ ایک وقت تھا کہ صرف ذاتِ باری تعالیٰ تھی' کائنات نہیں تھی۔ پھر کائنات کو وجود بخشا گیا تو اس کا اوّل اللہ ہے' جہاں سے یہ کائنات شروع ہو رہی ہے۔ اس کے بعد پھر ایک وقت آئے گا کہ صرف اللہ کی ذات ہو گی' کائنات نہیں ہو گی۔ گویا کہ یہ اس کا آخر ہے۔ چنانچہ اس کائنات کا اوّل و آخر ذاتِ باری تعالیٰ ہے' درمیان میں یہ کائنات ہے۔ اور اس کائنات میں ظاہر و باطن کی dimensions پیدا ہوئیں تاکہ احاطہ ہو جائے کہ وہی وہ ہے۔ ظاہر و باطن تو یقیناً بیک وقت (simultaneous) ہیں' ان میں مغائرت نہیں ہو سکتی۔ کسی شے کا ظاہر و باطن تو ساتھ ہی ہوں گے۔ پہلے دو اسماء مغائرت اور فصل کے متقاضی ہیں اس لئے ان کے درمیان حرفِ عطف آ گیا' اسی مناسبت سے پھر پوری آیت کے اندر حرفِ عطف لایا گیا۔ اس سے یہ بات اور واضح ہو جاتی ہے کہ درحقیقت اس آیۂ مبارکہ کا موضوع حقیقت وجود ہے۔

''وحدت الوجود'' کے بارے میں میرا موقف

اب آیئے اس بات کی طرف کہ وحدت الوجود کے بارے میں میرا کیا موقف ہے۔ اس ضمن میں پہلی بات یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ سن ۵۶۔۱۹۵۵ء میں' جبکہ میری عمر تینتیس' چونتیس برس تھی' میں اس مسئلے پر اپنا غور و فکر مکمل کر کے ایک حتمی رائے تک پہنچ چکا تھا' اور وہ حتمی رائے اُس وقت میرے ذہن میں کس انداز سے آئی تھی' اسے میں بیان کر رہا ہوں۔ جہاں تک ہمارے دین کی عملی حیثیت کا تعلق ہے اسے ہم شریعت اور طریقت سے تعبیر کرتے ہیں۔ شریعت اس دین کے عمل کا ظاہری پہلو ہے اور طریقت اس کا باطنی پہلو ہے۔ شریعت (فقہ) بحث کرے گی کہ نماز کے ارکان کیا ہیں' اوقات کیا

© rasailojaraid.com

ہیں‘ مختلف نمازوں کی رکعتیں کتنی ہیں‘ ہر رکعت میں ارکان کیا ہیں اوران کی ترتیب کیا ہے‘ وغیرہ‘ جبکہ اسی نماز کا جو ایک باطنی پہلو مطلوب ہے کہ خشوع وخضوع ہو‘ حضورِ قلب ہو‘ انسان ہمہ تن متوجّہ ہو‘ اپنی پوری شخصیت کے ساتھ اللہ کے سامنے جھکا ہوا کھڑا ہو‘ رکوع یا سجدہ میں ہے تو بھی پوری شخصیت جھک گئی ہو‘ یہ طریقت کا موضوع ہے۔ تو یہ جو دین کے عملی پہلو ہیں شریعت اور طریقت (یا ظاہر و باطن) ان دونوں کا تعلق یا ’’ہمہ از اوست‘‘ سے ہے یا ’’ہمہ با اوست‘‘ سے ہے۔ یعنی ان دونوں پہلوؤں کا تعلق یا تو اس سے ہے کہ سب کائنات اللہ کی ذات سے ہے‘ یا یہ کہ یہ سب سلسلۂ کون ومکان اللہ کی ذات کے ساتھ قائم ہے۔ ’’ہمہ از اوست‘‘ اور ’’ہمہ با اوست‘‘ کے مابین جو فرق ہے وہ میں بعد میں بیان کروں گا۔ ان کو اس درجہ میں سمجھ لیجئے کہ شریعت کا اوّلین درجہ ہے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ یعنی لَا مَعْبُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ ۔ یہاں معبود کو اس کے جامع مفہوم میں لیجئے کہ مطاعِ مطلق اللہ ہے‘ حاکم اللہ ہے‘ اسی کا حکم ماننا ہے اور درحقیقت رسول کا حکم بھی اسی کا حکم ہے‘ اُس کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں کرنی ہے‘ اس کے بتائے ہوئے حلال و حرام پر قائم رہنا ہے‘ اُسی سے ڈرنا ہے‘ اُسی سے سوال کرنا ہے‘ اُمید اُسی سے رکھنی ہے۔ پھر یہ کہ رازق وہی ہے۔ اسی طرح حاجت روا و مشکل کشا وہی ہے۔ یہ دین کا بالکل بنیادی تصور ہے۔ تو گویا پہلا قدم ’’لَا معبودَ اِلَّا اللّٰہ‘‘ ہے۔

اس سے اگلا قدم یہ ہے کہ لَا مَقْصُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ‘ لَا مَطْلُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ‘ لَا مَحْبُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ ۔ یعنی انسان کی زندگی میں مقصود و مطلوب کی حیثیت صرف اللہ کو حاصل ہو جائے‘ اس کا نصب العین صرف اللہ کی ذات ہو‘ محبوبِ حقیقی صرف اللہ ہو‘ باقی ساری محبتیں اس کی محبت کے تابع ہو گئی ہوں۔ یہ طریقت کی آخری منزل ہے۔ یہ وہ باطنی کیفیت ہے جو مطلوب ہے ﴿اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا﴾ کے مصداق انسان یکسو ہو کر اللہ کی ذات کی طرف متوجہ ہو گیا ہو‘ وہی اس کا مطلوب و مقصود اور وہی اس کا محبوب حقیقی بن گیا ہو۔ ان دونوں کا تعلق یا ہمہ از اوست سے ہے یا ہمہ با اوست سے۔ لیکن جو حقیقت ہے وہ ہمہ اوست کی وہ تعبیر ہے

جو شیخ ابن عربی نے کی ہے' یعنی وحدت الوجود۔ ہمہ اوست اور وحدت الوجود کے درمیان ایک باریک فرق ہے جو اگر ملحوظ نہ رہے تو بڑا خطرہ ہے ع ہوشدار کہ رہبر دمِ تیغ است قدم را! ذرا سی اگر بے احتیاطی ہو جائے تو انسان کفر اور شرک میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہ راستہ بہت خطرناک ہے۔ اور ویسے بھی اوّل تو اس حد تک رسائی بہت کم لوگوں کی ہوتی ہے' پھر اگر کوئی پہنچ بھی جائے تو اسے یہ احساس ہضم کرنا بہت مشکل ہے۔ مجھے سلطان باہو کا وہ مصرع یاد آ رہا ہے کہ ع جان پھُلن تے آئی ہو! واقعہ یہ ہے کہ جب انسان کو وحدت الوجود کا احساس ہوتا ہے تو وہ اپنے اندر ایک ایسی کیفیت محسوس کرتا ہے کہ اس کو ضبط میں لے آنا اور اپنی شخصیت کو اپنے مقام پر برقرار رکھنا آسان کام نہیں ہے۔ پھر یا تو وہ ہو گا جو منصور الحلاّج اور سرمد کے ساتھ ہوا تھا' کہ انہوں نے ''انا الحق'' کا نعرہ لگا دیا' یا ایک اور بڑی پیاری کیفیت ہے جس کا شیخ سعدی نے بڑے خوبصورت الفاظ میں ذکر کیا ہے کہ ع

آن را کہ خبر شد خبرش بعد نیامد!

کہ ''جو شخص یہاں تک پہنچ گیا پھر اس کی خبر نہیں ملتی۔'' یعنی پھر وہ خاموش ہو جائے گا' کیونکہ زبان کھولنے میں خطرہ ہے' اندیشہ ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ جب یہ چیزیں کچھ شعراء کے ذریعے سے' خاص طور پر حافظ کے ذریعے سے' عوام الناس میں آ گئیں تو اس سے بڑے خطرناک نتائج برآمد ہوئے اور دین و شریعت کی اہمیت ختم ہو کر رہ گئی۔ پھر ''مسجد مندر ٹھکر دنور'' کا فلسفہ پیش کیا گیا اور وحدتِ ادیان کا باطل نظریہ وجود میں آیا۔ اسی فتنہ کے سدباب کے لئے اور اس کا رُخ موڑنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے شیخ احمد سرہندیؒ کو کھڑا کیا' جن کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا ہے ۔

وہ ہند میں سرمایۂ مِلّت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار!

اُس وقت برعظیم پاک و ہند میں ملّتِ اسلامیہ اور اُمّتِ محمدؐ کا تشخص ختم ہو رہا تھا' اور یہ جو کہ در حقیقت ہمہ اوست اور وحدت الوجود کے مابین باریک فرق کو ملحوظ

© rasailojaraid.com

نہ رکھنے کے باعث اور ان کا عوام کی سطح پر اشعار کے ذریعے سے آ جانے کے باعث ہوا' جس کے خلاف شیخ احمد سرہندی نے علمِ جہاد بلند کیا۔ یہ بھی نوٹ کر لیجئے کہ شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے ساتھ علامہ اقبال کو بہت سے اعتبارات سے خصوصی نسبت حاصل ہے۔ علامہ اقبال نے بھی برعظیم میں مسلم قومیت کے تشخص کو واضح کیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اگر ان کا فکر و فلسفہ اور ان کی عظیم شخصیت نہ ہوتی تو بیسویں صدی کے آغاز میں وحدتِ ادیان کا جو فلسفہ گاندھی کے ذریعہ بہت شد و مد کے ساتھ آیا تھا اس کے آگے بند باندھنا ممکن نہ رہتا۔ اور تو اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسی نابغہ شخصیت بھی اس رو میں بہہ گئی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس برعظیم پاک و ہند میں اُس وقت پھر وہی صورت حال پیدا ہو رہی تھی جو تین سو برس پہلے ہوئی تھی کہ جب ''دینِ الٰہی'' کی شکل میں ایک نیا دین گھڑ لیا گیا تھا اور دین محمدیؐ کے خاتمہ کا خدشہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس بار اس فتنے کا مقابلہ کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے علامہ اقبال کو اٹھایا۔ آپ ایک مفکر اور فلسفی تھے' ان کی بات میں وزن تھا' ان کا انداز لوگوں کے دل کو بھانے والا تھا۔ پھر وہی شخص تھا جو پنڈت نہرو سے بھی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتا تھا۔ ختم نبوت پر ان کی نہرو کے ساتھ بڑی مدلل و مفصل خط و کتابت ہوئی۔ ظاہر ہے کوئی عالم دین تو پنڈت نہرو کے ساتھ بحث و تکرار نہیں کر سکتا تھا۔ علماء کرام ختمِ نبوت پر قرآن و حدیث سے تو دلائل دے سکتے تھے' لیکن اس کی فلسفیانہ بحث علامہ اقبال کے سوا کسی نے نہیں کی۔ علامہ اقبال شروع میں حافظ کے شدید دشمن رہے اور اس فلسفے کی انہوں نے بڑی شِدّت کے ساتھ نفی کی۔

''سورج مکھی کے پھول بن جاؤ!''

جیسا کہ میں نے عرض کیا' اُس زمانے (۵۶۔۱۹۵۵ء) میں مَیں اس نتیجہ پر پہنچ گیا تھا کہ طریقت اور شریعت دونوں کا تعلق ''ہمہ از اوست'' یا ''ہمہ با اوست'' سے ہے' جب کہ حقیقت ''وحدت الوجود'' ہے جو ''ہمہ اوست'' ہی کی ایک محتاط تعبیر ہے۔ اُس زمانے میں ایک تشبیہہ یا تمثیل بھی میرے ذہن میں آئی تھی کہ ''سورج مکھی کے

پھول بن جاؤ!'' اس کی میں وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ اس سے کیا مراد ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ سائنس کے نظریات میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ لیکن میں جس زمانے کی بات کر رہا ہوں اُس وقت یہ خیال بہت غالب تھا کہ ہماری یہ زمین درحقیقت سورج کا ایک ٹوٹا ہوا ٹکڑا ہے اور دوسرے سیارے جو سورج کے گرد گردش کر رہے ہیں وہ بھی سورج ہی کے ٹکڑے ہیں۔ چنانچہ جس طرح سورج اپنے محور کے گرد حرکت کر رہا ہے اسی momentum کا نتیجہ ہے کہ اس سے ٹوٹنے والے ٹکڑے بھی اس کے گرد چکر لگانے لگے۔ تو گویا یوں سمجھئے کہ ابتدا میں ہماری زمین بھی آگ کا ایک بہت بڑا کُرہ تھی، پھر یہ ٹھنڈا ہونا شروع ہوئی۔ اس کے ٹھنڈا ہونے کے دو نتیجے نکلے۔ ایک یہ کہ اس سے بخارات نکلے جو اوپر گئے تو انہوں نے فضا (کُرۂ ہوائی) کی صورت اختیار کی۔ دوسرے یہ کہ ٹھنڈا ہونے کی وجہ سے خود زمین سکڑ گئی، جس کے نتیجے میں اس کی سطح پر کہیں بلندیاں پیدا ہو گئیں اور کہیں گہرے غار وجود میں آ گئے۔ فضا کا غلاف ہماری زمین کے گرد تیس پینتیس میل ہے۔ فضا میں جمع ہونے والی گیسوں کے نتیجہ میں بارش ہوئی اور نہ معلوم کتنے عرصہ تک بارش ہی ہوتی رہی، جس سے نشیبی علاقوں میں پانی جمع ہو گیا اور اس طرح سمندر وجود میں آئے۔ جو علاقے اونچے تھے وہ خشکی قرار پائے۔ پھر جہاں یہ برّ و بحر آپس میں جڑے ہوئے تھے وہاں دلدلی علاقوں میں حیاتِ ارضی کا آغاز ہوا۔ یہ حیاتِ ارضی دو طرح کی تھی: ا۔ حیاتِ نباتاتی (Plant Kingdom) ۲۔ حیاتِ حیوانی (Animal Kingdom)۔

حقیقت کے اعتبار سے تو کہا جا سکتا ہے کہ اس زمین پر جو بھی ہے وہ سورج ہی سے ہے (ہمہ از اوست) یہ سب سورج ہی کا ظہور ہے۔ زمین بھی سورج ہی کا ٹکڑا تھی جو ٹھنڈا ہوا، پھر اسی میں سے gases نکلی تھیں، خارج سے تو کوئی شے نہیں آئی۔ ہوا بھی وہیں سے ہے، خشکی بھی وہی سے ہے اور سمندر بھی وہیں سے ہے۔ پھر وہیں کے امتزاج (interaction) سے اس دلدلی علاقے میں حیاتِ نباتاتی اور حیاتِ حیوانی کا آغاز ہوا۔ گویا زمین پر جو کچھ ہے اس کا ماخذ (origion) سورج ہے۔ گویا یہ تو ہوئی

© rasailojaraid.com

حقیقت۔ اصل طریقت اور شریعت کیا ہے؟ وہ سورج مکھی کے پھول کا طرزِ عمل ہے۔ جیسے ہی سورج طلوع ہوتا ہے وہ اپنا رخ سورج کی طرف کر لیتا ہے' جیسے جیسے سورج گردش کرتا ہے اس کا رخ بدلتا جاتا ہے' جب سورج غروب ہوتا ہے تو پھول بھی مرجھا جاتا ہے۔ اگلی صبح جب سورج طلوع ہوتا ہے تو وہ پھر ترو تازہ ہو جاتا ہے۔ گویا کہ سورج مکھی کے پھول نے اپنے وجود کا مقصد اور اپنا نصب العین یہ مقرر کیا کہ وہ اپنے اصل مبدأ کی طرف اپنی توجہ مرکوز رکھے۔ یہی طرزِ عمل ایک بندۂ مومن سے مطلوب ہے:

﴿اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ﴾ بجائے اس کے کہ سورج مکھی کا پھول اس سوچ بچار میں غلطاں و پیچاں رہے کہ میں کہاں سے آیا ہوں' سورج کا ٹکڑا ہوں' میری زمینی حیات کا آغاز کیسے ہوا' کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ اپنا رخ سورج کی طرف رکھو۔ اسی طرح ہمیں اس فکر میں غلطاں و پیچاں ہونے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہم کہاں سے وجود میں آئے ہیں اور کیسے وجود میں آئے ہیں' ہمارے وجود اور ہماری زندگی کا مقصد صرف یہ ہونا چاہئے کہ ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ﴾ اور ﴿اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ سورج مکھی کے پھول کی طرح ہمارے دل کی کلی کھلے تو اس سے کہ ہم اللہ کو یاد کر رہے ہیں' اللہ کے حضور میں حاضر ہیں۔ اور اگر کہیں بھی بندۂ مومن محسوس کرے کہ غیاب ہو گیا ہے' حضوری نہیں رہی' کوئی بُعد ہو گیا ہے' میری توجہ کسی اور طرف مبذول ہو گئی ہے' میں کچھ غافل ہو گیا ہوں تو فوراً اس پر پچھتاوے کی کیفیت طاری ہو اور وہ پھر اپنا رخ اسی کی طرف کر لے' جیسے سورج مکھی کا معاملہ ہے کہ سورج طلوع ہوتے ہی وہ کھل اٹھتا ہے اور پورا دن جدھر سورج جاتا ہے ادھر ہی وہ ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہتا ہے' اور جب سورج غروب ہوتا ہے تو وہ بھی بجھ کر رہ جاتا ہے۔ یہ ہے اصل میں حقیقت' طریقت اور شریعت۔ حقیقت تو یہی ہے کہ سورج مکھی بھی سورج سے نکلی ہوئی ایک شے ہے' لیکن ہماری توجہ اصلاً طریقت اور شریعت پر مرکوز ہونی چاہئے۔

وحدت الوجود‘ مجدّد الفِ ثانی اور علامہ اقبال

آج میں یہ بھی عرض کردوں کہ لاہور منتقل ہونے کے بعد ۶۵ء سے ۷۱ء تک قریباً چھ سال مجھے پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم کی صحبت سے فیض یاب ہونے کا بڑا وافر اور مسلسل موقع ملا ہے۔ میرا کلینک کرشن نگر میں تھا جو اَب اسلام پورہ کہلاتا ہے۔ چشتی صاحب روزانہ شام کو میرے پاس آجاتے تھے اور ان سے میرا تبادلۂ خیالات ہوتا تھا۔ اس طرح میں نے دس بارہ سال قبل جو پختہ رائے قائم کر لی تھی‘ اس میں مجھے نہ صرف پختگی حاصل ہوئی بلکہ اس خاکے میں رنگ بھرا گیا۔ اس ضمن میں مَیں ان کا احسان مند ہوں۔ اُس وقت تک میں نے نہ تو شیخ احمد سرہندی کی مکتوبات کا مطالعہ کیا تھا نہ علامہ اقبال کے فارسی کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کیا تھا‘ لہٰذا یہ حقیقت مجھے درحقیقت ان کے ذریعے ہی معلوم ہوئی کہ شیخ احمد سرہندیؒ بھی اپنی زندگی کے آخری دَور میں وحدت الوجود کے قائل ہو گئے تھے۔ اس پر انہوں نے کلامِ اقبال کی شروحات میں بڑی مفصل تحریریں لکھی ہیں اور یہ بات ثابت کی ہے۔ اسی طرح علامہ اقبال نے بھی زندگی کے آخری دَور میں ’’لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ‘‘ کا نعرہ بڑے بلند آہنگ کے ساتھ بلند کیا تھا۔ ان کی ایک رباعی ملاحظہ کیجئے جو علامہ نے اپنی وفات سے کل تین ماہ قبل کہی تھی ؎

تو اے ناداں دلِ آگاہ دریاب
بخود مثلِ نیاگاں راہ دریاب
چساں مؤمن کند پوشیدہ را فاش
ز لا موجودَ اِلَّا اللّٰہ دریاب!

’’اے غافل! تو ایسا دل حاصل کر جو آگاہ ہو۔ جیسے تمہارے بزرگ خود راستہ تلاش کرتے رہے ہیں (اور غور و فکر کے ذریعے سے حقیقت تک پہنچتے رہے ہیں) اسی طرح تم بھی کوشش کرو (یعنی محض تقلید کی روش اختیار نہ کرو بلکہ تحقیق کا راستہ اختیار کرو۔) جس طرح مؤمن پوشیدہ کو رفتہ رفتہ فاش کرتا ہے تم ’’لا موجود الا اللّٰہ‘‘ سے حقیقت تک رسائی حاصل کرو۔‘‘

یہ گویا فکرِ انسانی کی آخری منزل ہے۔ تو حضرت مجدد الف ثانیؒ بھی وہیں پہنچے

© rasailojaraid.com

تھے اور علامہ اقبال بھی بالآخر وہیں پہنچے۔ بلکہ علامہ اقبال کے بعض اشعار تو ایسے ہیں کہ تصوف اور ہمہ اوست کا عامیانہ تصور بھی ان کے یہاں موجود ہے۔ لیکن میں اس وقت اس طرف نہیں جانا چاہتا کہ ان کی کیا تاویل کی جائے گی۔ میں نے اِس وقت صرف یہ بتایا ہے کہ سن ۵۶۔ ۱۹۵۵ء میں میری جو رائے قائم ہو چکی تھی اس کے بعد سن ۶۵ء سے ۷۱ء تک کے عرصہ میں اس میں پختگی پیدا ہوئی۔ اب میں چاہتا ہوں کہ ذرا اس کی وضاحت کر دوں۔ جہاں تک ''ہمہ از اوست'' کا تعلق ہے یہ تمام مسلمان اہل سنت' متکلمین' ائمہ اور علماء دین کے نزدیک متفق علیہ بات ہے۔ یہ توحید کا کم سے کم تقاضا ہے کہ جو کچھ ہے اللہ سے ہے (ہمہ از اوست) یعنی وہ خود بخود وجود میں نہیں آیا' بلکہ اللہ کا تخلیق کردہ ہے۔ جیسے سورۃ الطّور آیت ۳۵ میں فرمایا گیا: ﴿اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَیْءٍ اَمْ هُمُ الْخَالِقُوْنَ ۞﴾ ''کیا یہ خود بخود بن گئے (کسی کے بنائے بغیر) یا یہ خود اپنے آپ کو بنانے والے ہیں؟'' ظاہر بات ہے کہ بنانے والا اللہ ہے۔ نہ از خود کوئی بنا ہے اور نہ یہ اپنے آپ کو بنانے والے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ مضمون دو مقامات پر آیا ہے۔ سورۂ لقمان کی آیت ۱۱ میں یہ مضمون بایں الفاظ آیا ہے:

﴿هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِیْ مَا ذَا خَلَقَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ﴾

''یہ سب اللہ کی تخلیق ہے' ذرا بتاؤ کہ اس کے سوا بھی کسی نے کچھ بنایا ہے؟''

''ہمہ از اوست'' تو عقیدۂ توحید کی مبادیات میں سے ہے جس میں کسی کو کوئی شک نہیں ہو سکتا۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ ''ہمہ با اوست'' کیا ہے؟ یہ اصل میں وہ نظریہ ہے جو فلسفۂ وجود کی پہلی منزل کی نشان دہی کرتا ہے۔

ہمارے اسلاف میں ایک تو علاؤ الدین صدانیؒ ہیں جنہوں نے سب سے پہلے یہ نظریہ پیش (enunciate) کیا اور پھر یہ زیادہ مشہور مجدد الف ثانیؒ کے نظریہ وحدت الشہود کے نام سے ہوا۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ کائنات اور خالق دونوں کا وجود اپنی اپنی جگہ پر ہے۔ اب ظاہر ہے کہ دونوں کا ساتھ ساتھ تو ثنویت ہے' پھر تو (خالق اور مخلوق) دو وجود ہو گئے! چنانچہ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے ڈاکٹریٹ کا جو تھیسز لکھا

om

تھا: "Mujaddid's Concept of Toaheed" وہ مجھے بہت پسند ہے۔ اکثر لوگوں کی نظروں سے حضرت مجددؒ کا آخری موقف اوجھل ہے' لیکن عام طور پر جو چیز ان کی طرف منسوب ہوتی ہے وہ یہی ثنویت (Dualism) ہے' توحید وجودی نہیں ہے۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے اسے واضح طور پر تسلیم کیا ہے۔ ایک دیانت دارانہ تحقیق کا تقاضا یہی ہے کہ اس کا جو بھی نتیجہ نکل رہا ہے آدمی اسے بیان کرے۔ بہر حال یہ ثنویت ہے اور ایک اعتبار سے اسے شرک فی الوجود کہا گیا ہے۔

''ہمہ اوست'' اور اس کی مختلف تعبیرات

غالبؔ کا ایک شعر ہے۔

جاروبِ لا بیا کہ ایں شرک فی الوجود
با درجہ فرش و سینہ بایوان برابر است

یعنی ہمارا سینہ ایک ایوان کی مانند ہے اور یہ شرک فی الوجود (کہ وجود ہمارا بھی ہے اور اللہ کا بھی) اُس گرد کی مانند ہے جو اس ایوان پر آ گیا ہے۔ چنانچہ ''لا'' کی جھاڑ لاؤ اور اس سے اسے صاف کر دو۔ شرک فی الوجود کا خاتمہ توحید وجودی سے ہوتا ہے' جس کی ایک تعبیر ''ہمہ اوست'' ہے۔ دنیا بھر میں جو چوٹی کے نظریاتی (idealist) فلسفی ہیں وہ اسی کے قائل ہیں۔ ان کا نقطۂ آغاز افلاطون ہے۔ حکیم فلاطینوس کا تعلق سکندریہ (مصر) سے تھا جس کے نظریات ہمارے مسلمانوں کے تصوف میں سرایت کر گئے۔ اسی طرح ابن عربی اندلس سے متعلق تھے۔ اس ضمن میں دو بڑی شخصیتیں برعظیم میں مشہور ہوئیں۔ ایک ہندوؤں میں شنکراچاریہ اور دوسرے اورنگزیب عالمگیر کے عہد میں مرزا عبدالقادر بیدلؔ' جو فارسی کے عظیم شعراء میں سے ہیں۔ یہ چار چوٹی کے لوگ ہیں جنہوں نے اس نظریئے کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ البتہ اس کے جو تین shades ہیں اور اس اعتبار سے اس کی جو تین تعبیرات ہیں انہیں علیحدہ علیحدہ identify کر لیجئے۔ اسی حوالے سے میں نے کہا تھا کہ ع

ہوشدار کہ رہبر دم تیغ است قدم را!

© rasailojaraid.com

اس فرق کو اگر ملحوظ نہیں رکھیں گے تو شرک و کفر ہو جائے گا۔

ہمہ اوست کی ایک تعبیر Pantheism ہے۔ یعنی جب وجود ایک ہی ہے تو یہ کائنات گویا خدا کا حصہ ہے یا ہمہ تن خدا ہے' خود خالق ہی نے مخلوق کی شکل اختیار کر لی' جیسے برف پگھل کر پانی بن گئی اور پانی کو آپ نے ابالا تو وہ بھاپ بن گیا۔ اب پانی ہی برف بھی ہے اور بھاپ بھی ہے۔ اس نظریئے میں کائنات کو حقیقی مانا گیا ہے کہ یہ درحقیقت واقعی ہے اور یہ خالق کا حصہ ہے یا خالق ہی ہے۔ اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ یہ عظیم ترین کفروشرک ہے اور اس کا اسلام کے ساتھ یا حقیقت کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں ہے۔

دوسری تعبیر وہ ہے جو حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اپنی زندگی کے آخری دَور میں اختیار کی کہ حقیقت میں وجود ایک ہی ہے جو اللہ کا ہے' جو کچھ نظر آ رہا ہے وہ درحقیقت ہے ہی نہیں۔ اس کی مثال میں دے چکا ہوں کہ آپ ایک مشعل کو دائرے کی صورت میں حرکت دیں تو ایک آتشیں دائرہ نظر آئے گا جو حقیقت میں موجود نہیں ہے۔ یہ دراصل اس کائنات کی نفی ہے کہ اس کا کوئی وجود ہے ہی نہیں۔ چنانچہ وجود صرف ایک ذاتِ باری تعالیٰ کا رہ گیا' جس سے شرک اور ثنویت کا خاتمہ ہو گیا۔ اسی کو غالبؔ نے یوں بیان کیا ہے ۔

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے!

اور عربی شعر میں آپ کو پہلے بھی سنا چکا ہوں ۔

کل ما فی الکون وَھمٌ او خیال
او عُکوس فی المَرایا او ظلال

یعنی کائنات میں جو کچھ موجود ہے وہ محض وہم یا خیال ہے' یہ یا تو محض آئینوں میں نظر آنے والے عکس ہیں یا سائے ہیں۔ حقیقت میں تو صرف ذاتِ باری تعالیٰ کا وجود ہے اور کوئی شے حقیقتاً موجود نہیں ہے ع

om

ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے!

لیکن یہ بات کہ کائنات کا وجود ہے ہی نہیں، قابل قبول نظر نہیں آتی۔ یہ ایک شاعرانہ خیال یا فلسفیانہ توجیہہ تو ہو سکتی ہے، لیکن کائنات تو بڑی ٹھوس حقیقت ہے۔ آپ نے شرک فی الوجود کی نفی کرنے کے لئے کائنات ہی کی نفی کر دی؟

میرے نزدیک اس کا اصل حل وہ ہے جو شیخ ابن عربیؒ نے دیا ہے، جو مَیں بیان کر چکا ہوں، کہ حقیقت و ماہیت وجود کے اعتبار سے خالق و مخلوق کا وجود ایک ہے، کائنات میں وہی وجودِ بسیط سرایت کئے ہوئے ہے، لیکن جہاں تعین ہو گیا تو وہ پھر غیر ہے، اُس کا عین نہیں۔ چنانچہ ان کا کہنا ہے کہ یہ کائنات کا وجود ایک اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے وجود کا عین اور دوسرے اعتبار سے اس کا غیر ہے۔ یہ ابن عربی کا فلسفہ ہے۔ اور ابن عربی ہمارے دینی حلقوں کی سب سے زیادہ متنازعہ فیہ (controvercial) شخصیت ہیں۔ ان کی حمایت اور مخالفت دونوں انتہا کو پہنچی ہیں۔ ہمارے صوفیاء کی عظیم اکثریت انہیں شیخ اکبر کے نام سے جانتی ہے۔ ان کی کتابیں ''فصوص الحِکَم'' اور ''فتوحاتِ مکّیہ'' تصوف کی بہت اہم کتابیں ہیں۔ دوسری طرف اختلاف بھی اتنا شدید ہے کہ امام ابن تیمیہؒ نے ان کو ملحد و زندیق قرار دیا ہے اور جو بھی شرعی گالی ہو سکتی تھی ان کو دی ہے۔ میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں اگر شیخ اکبر کی کسی بات کی تائید کر رہا ہوں تو وہ ان کا صرف یہ نظریہ ہے، باقی میں نے نہ فصوص الحِکَم کا مطالعہ کیا ہے، نہ فتوحاتِ مکیہ کا۔ یہ بڑی دقیق کتابیں ہیں اور آدمی جب تک قدیم فلسفہ و منطق میں مہارتِ تامہ بہم نہ پہنچا لے اس کے لئے ان کتابوں کا پڑھنا آسان کام نہیں ہے۔ ویسے بہت سی باتیں ان کی طرف غلط بھی منسوب کر دی گئی ہیں، جیسا کہ پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم نے اپنی کتاب ''اسلامی تصوف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش'' میں بہت سی مثالیں دی ہیں کہ خاص طور پر ہمارے ہاں جو باطنی لوگ تھے (جو شیعیت کا ایک شیڈ تھا) انہوں نے اہل سنت کو گمراہ کرنے کے لئے صوفیاء کی طرف بہت غلط باتیں منسوب کی ہیں۔ انہوں نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک بہت بڑے عالم اور صوفی کسی جگہ گئے تو وہاں ایک مسجد

© rasailojaraid.com

میں ان کی کتاب کا درس ہو رہا تھا' جسے سن کر انہوں نے کہا کہ توبہ توبہ میں نے یہ بات آج تک کبھی نہیں کی' بلکہ یہ بات تو میرے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آئی۔

اس اعتبار سے دیکھیں تو یہ بہت بڑی بات ہے جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم اس کتاب (القرآن) کے خود محافظ ہیں ﴿اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ ﴾ کتابِ الٰہی کا محفوظ رہنا بھی آسان کام نہیں ہے جب تک کہ اللہ کا خصوصی فیصلہ نہ ہو۔ اسی لئے تو ایک دَور میں احادیث نبویؐ میں موضوع روایات کا ایک ایسا طومار شامل کر دیا گیا تھا کہ پھر محدثین کو پوری پوری زندگیاں کھپانی پڑیں اور انہوں نے موضوع روایات کو الگ کیا اور صحیح وضعیف احادیث کو بھی علیحدہ علیحدہ کیا۔ اسی طرح اہلِ تصوف کی طرف بہت سی غلط باتیں منسوب کی گئی ہیں۔ میں نہ تو ابنِ عربی کا وکیل ہوں اور نہ ان کی ہر بات کی ذمہ داری لیتا ہوں۔ ان کے ہاں جو تضاد موجود ہے اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ان ہی کی طرف یہ شعر بھی منسوب ہے کہ ؎

الرّب عبدٌ والعبد ربٌّ
یا لیتَ شعری من المُکلّف!

''ربّ ہی عبد ہے اور عبد ہی ربّ ہے (یعنی خالق ومخلوق ایک ہی ہیں) تو میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کس کو حکم دیا جا رہا ہے (کہ عبادت کرے اور کس کی عبادت کرے!)''

لیکن دوسری طرف ان ہی کا ایک شعر ہے ؎

الرّبّ رَبٌّ وان تنزّل
والعبد عبدٌ وان ترقّٰی

''اللہ' اللہ ہی ہے' چاہے وہ کتنا ہی نزول فرما لے اور بندہ' بندہ ہی رہے گا چاہے جتنا بھی بلند ہو جائے''۔

حضور ﷺ ساتویں آسمان تک گئے ہیں لیکن وہ معبود نہیں بن گئے' بلکہ عبد ہی رہے ہیں۔

میں نے اس مسئلہ کو ایک اور طریقے سے بہت ہی سادگی کے ساتھ حل کیا ہے۔ مجھ پر یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہے کہ میری گفتگو' میرا غور وفکر اور میرے اخذ کردہ

نتائج بالکل mathematical اور الجبرا کے فارمولوں کی طرح ہوتے ہیں۔ آج سے ۳۵ سال پہلے میری جو رائے تھی وہ میں بیان کر چکا۔ آج اس ضمن میں میری کیا رائے ہے اور اس کا صغریٰ کبریٰ کیا ہے‘ یہ میں ان شاء اللہ العزیز اگلی نشست میں بیان کروں گا۔

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ﴾ کے حوالے سے میں ایک بات کی وضاحت کرنا چاہ رہا ہوں۔ ظاہر اور باطن کے اعتبار سے اس آیت کی کچھ مزید وضاحت ہونی چاہئے تھی جو نہیں ہو سکی۔ اس حوالے سے امام رازی کا ایک قول آپ کو سنانا چاہوں گا۔ اللہ تعالیٰ ظاہر بھی اتنا ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی ظاہر نہیں‘ وہ self evident ہے‘ آفتاب آمد دلیل آفتاب! اس لئے کہ پوری کائنات درحقیقت اسی کا ظہور ہے۔

معمور ہو رہا ہے عالَم میں نور تیرا
از ماہتاب و ماہی سب ہے ظہور تیرا!

تو ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر ظاہر کون ہوگا؟

ردائے لالہ و گل‘ پردۂ ماہ و انجم
جہاں جہاں وہ چھپے ہیں عجیب عالَم ہے!

پوری کائنات کے اندر اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت‘ اُس کے علم اور اس کی حکمت کا ظہور ہے۔

وفی کلّ شیءٍ لہ آیۃٌ
تدلّ علی انّہ واحدٌ

ہر شے میں اُس کی نشانی موجود ہے جو یہ دلالت کرتی ہے کہ وہ اکیلا ہے‘ تنہا ہے۔ لیکن اپنی کُنہ کے اعتبار سے اور اپنی ذات کے اعتبار سے وہ اس قدر باطن اور خفی ہے کہ اسے کوئی نہیں جانتا۔ اللہ تعالیٰ کے اس ظاہر اور باطن ہونے میں امام رازی نے بڑی خوبصورت نسبت قائم کی ہے۔ ان کا قول ہے کہ:

© rasailojaraid.com

ان کمال کونہ ظاھرا سبب لکونہ باطنا' فسبحان من اختفٰی عن العقول لشدۃ ظھورہ واحتجب عنھا بکمال نورہ

''درحقیقت اس کے ظہور کی شدت اور کمال ہی اس کا سبب ہے کہ وہ نگاہوں سے چھپ گیا ہے (سورج جب نصف النہار پر چمک رہا ہوتو آپ آنکھ بھر کر اسے دیکھ نہیں سکتے' اس کی وجہ اس کی شدتِ ظہور ہے جس کے باعث آپ کی نگاہ چکا چوند ہو جاتی ہے۔) بس بڑی پاک ہے وہ ذات جو اپنے شدتِ ظہور کے باعث عقولِ انسانی سے چھپ گئی ہے اور اپنے نور کے کمال کے باعث عقولِ انسانی سے حجاب میں آ گئی ہے''۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ظاہر اور باطن ہونا تو بیک وقت (simultaneous) ہے اور ان دونوں میں جو گہرا رشتہ ہے اس کی اس طرح تاویل کی جاسکتی ہے جیسے امام رازی نے فرمائی ہے۔ وحدت الوجود کے مسئلہ کو جس طور سے میں نے حل کیا ہے وہ میں اگلی نشست میں عرض کروں گا۔

بارک اللّٰہ لی ولکم فی القرآن العظیم

ونفعنی وایاکم بالآیات والذکر الحکیم oo

فلسطین نمبر' اقبال نمبر' عراق نمبر کے بعد ''ندائے خلافت'' کی نئی دستاویزی پیشکش

نظریۂ پاکستان نمبر

مرتبہ: سید قاسم محمود

❁ نظریۂ پاکستان کیا ہے؟ یہ دوقومی نظریئے سے کیوں مختلف ہے؟ ❁ برعظیم پاک و ہند میں نظریۂ پاکستان کا ارتقاء کیونکر ہوا؟ ❁ نظریۂ پاکستان کے برعکس نظریئے ''ہندو مت'' کا تعارف ❁ ہندوؤں نے ایک ہزار سال کی تاریخ میں مسلمانوں کو کیا دیا؟ ❁ اور مسلمانوں نے ہندوؤں کو کیا دیا؟ ❁ اور دوسرے بہت سے گوشے جن کی نقاب کشائی اس خاص نمبر میں پہلی مرتبہ کی جارہی ہے۔

نظریۂ پاکستان نمبر

14 / اگست کو شائع ہو رہا ہے۔ ان شاء اللہ!